فکر و نظر ---- اسلام آباد جلد : ۳۸ شمارہ : ۲

برصغیر کے تفسیری رجحانات ---- تفاسیر بالرائے

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی ☆

تاریخِ انسانی کے اوراق گواہ ہیں کہ کتاب الٰہی سے پیوستگی اور قرآنِ ناطق ﷺ کی اطاعت شعاری نے مسلمانوں کے افقِ ذہنی کو ہمیشہ تابدار رکھا، قرآن مجید کے نزول کی ابتداء ہی سے نبوی راہنمائی کے زیر سایہ اس کی وسعتوں کی تلاش جاری ہوئی۔ قرآن سے قرآن کے مفاہیم کی تحدید و تعیین کا اہتمام ہوا تو جہاں ابہام، شک اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہوئی تو بقول علامہ ابن حجر العسقلانیؒ : فَبَابُ مَحمدٍ بَابُ الرَّجَاءِ،(۱) درِ رسالت سے یقین کی دولت عطا ہوتی رہی اور لفظ و معنی کا رشتہ استحکام پاتا رہا۔ لغتِ عرب کی مناسبت بھی سہولت بہم پہنچاتی رہی اگرچہ علامہ ابن خلدون کا یہ قول کہ :

> " قرآن لغتِ عرب میں نازل ہوا اور انہیں کی بلاغت کے اسلوب اس کے اندر کام میں لائے گئے اس لیے تمام عرب قرآن مجید کو سمجھتے تھے اور اس کے مفردات اور مرکبات کے مطالب ان پر واضح تھے"۔(۲)

رجائی روّیہ کا ترجمان ہے کیونکہ ابن قتیبہ کو یہ اعتراف تھا کہ :

> " عرب قرآن مجید کے تمام غریب اور متشابہ کے سمجھنے میں برابر نہیں ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فہمِ قرآن کے باب میں بعض کو بعض پر تفوق حاصل ہے"(۳)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مراتبِ فہم کا یہ تفاوق مفسرین کے پیش نظر رہا ہے اور اس کا اثر تابعین بلکہ تبع تابعین کی درجہ بندی پر پڑا ہے اور آخرکار تفاسیر کے

☆ وائس چانسلر، محی الدین اسلامی یونیورسٹی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر

ذخیرے پر بھی صلاحیت، پیش کش اور معیار کے حوالے سے جاری رویہ حاوی رہا ہے، مفسرین اور شارحین کے مرتبہ و مقام اور ان کے ذھنی و قلبی رجحان نے بھی ان کی نگارشات کی تقسیم کی ترغیب دی ہے اس طرح تفسیر کا علمی سرمایہ کئی حوالوں سے جانچا گیا اور اس رتبہ شناسی کے عمل میں ذاتی نظریات اور گروہی میلانات بھی اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں: اس تفاوت بلکہ تضاد کے باوجود حقائق کا چہرہ دھندلایا نہیں، یہی امت مسلمہ کی بقا اور تحفظ کی ضمانت ہے۔ بہتر ہوگا کہ تفسیری رجحانات کے جائزے اور تفسیر بالرائے پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے تفسیر قرآن کی جامع تعریف اور اس کی حدود کا تعین کر لیا جائے۔

تفسیر

تفسیر قرآن سے کیا مراد ہے اس پر لغوی، معجمی اور اصطلاحی حوالوں سے بہت گفتگو ہوئی ہے، اختصار کی خاطر صرف جامع حوالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے:

--- ابو حیان الاندلسی نے البحر المحیط میں اس کی جامع تعریف کی، کہتے ہیں:

"علم یبحث عن کیفیة النطق بألفاظ القرآن و مدلولاتها، وأحکامها الإفرادیة والترکیبیة. وَمعانیها التی تحمل علیها حالة الترکیب، و تتمات لذلك"(۴)

"علم تفسیر ایک ایسا علم ہے جس میں قرآن حکیم کے الفاظ کی کیفیت نطق، ان کے مدلولات، ان کے افرادی و ترکیبی احکام اور ان معانی سے بحث کی جاتی ہے جن پر وہ الفاظ حالت ترکیب محمول کیے جاتے ہیں اور اس کے لیے بعض تتمات پر بھی"

علامہ سید مرتضٰی الزبیدی نے شرح 'احیاء العلوم' میں اس عبارت کو نقل کیا اور وضاحت فرمایا:

ابو حیان کے اس قول میں علم جنس ہے اور اس کے بعد جو قیود آئی ہیں وہ بمنزلہ فصل ہیں چنانچہ یبحث فیه عن کیفیة النطق بألفاظ القرآن سے مراد علم قراء ت ہے 'ومدلولاتھا' سے مراد انھیں الفاظ قرآن کے مدلولات ہیں اس کا مصداق متن علم لغت ہے جس کے بغیر

الفاظِ قرآن کے مدلولات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ احکامها الافرادية والتركيبية، اس کے لیے علم تصریف، بیان اور بدیع کی ضرورت ہے، 'ومعانيها التی تحمل عليها حالة التركيب' سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو معانی پر الفاظ کی دلالتِ حقیقی اور دلالتِ مجازی سے واقفیت ہو کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترکیب اپنے ظاہر کے اعتبار سے کسی چیز کا اقتضاء کرتی ہے لیکن اس کے لیے کوئی مانع ہوتا ہے تو اب لفظ سے کوئی معنی مجازی مراد لینے پڑتے ہیں۔ پھر آخر میں ابو حیان نے " وتتمات لذلك" جو کہا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو نسخ اور سببِ نزول وغیرہ کا علم ہونا چاہئے تاکہ قرآن میں جو باتیں مبہم ہیں وہ معلوم ہو سکیں"(۵)

علامہ الزرکشی نے بھی ایسی ہی تعریف کی ہے۔(۶) اس سے واضح ہوا کہ علم تفسیر کا بنیادی تقاضا علوم عربیہ کی دسترس ہے یہ تو وہ اساسی احتیاج ہے کہ اس کے بغیر اس فن شریف کی ابجد سے بھی آگاہی ممکن نہیں۔ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے " عليكم بديوانكم لا تضلوا، قالوا: وماديواننا؟ قال: شعرالجاهلية فإن فيه تفسير كتابكم و معانى كلامكم"(۷) (اپنے دیوان کو لازم رکھو، تم نہ بھٹکو گے، کہا، کون سا ہمارا دیوان، فرمایا: شعر جاہلی کہ اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر اور تمہارے کلام کی مراد ہے)۔

امام بیہقی نے امام مالک رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے " لا أُوتى برجل غير عالم بلغة العرب يفسر كتاب الله إلاّ جعلته نكالاً "(۸)

لغتِ عرب پر لائق اعتماد نظر اور عرب محاورہ سے کماحقہ آشنائی، علم تفسیر کی پہلی منزل ہے، پھر رسول اکرم ﷺ کے ارشادات اور تعلیمات سے باخبری اور ثقہ و غیر ثقہ روایات کی پہچان کا ملکہ عملی اقدام کا زادِ سفر ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور بعض نامور مفسرین نے ہر الجھن کا حل اُسوہ رسول ﷺ میں تلاش کیا، مفسرین کی کثیر تعداد اسی روش پر جمی رہی ان کی تفاسیر کو روایت کی سند حاصل رہی اور اس طرز تفسیر کو تفسیر بالماثور

کہا گیا، اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ ان تفاسیر میں عقل وشعور کو مذموم گردانا گیا یا فکر و تدبر سے کنارہ کشی کی گئی، اس لیے کہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا، غور وفکر کی برملا دعوت اسلامی تعلیمات کا امتیازی وصف ہے اور قرآن مجید نے تدبر و تفکر کے بارے میں متعدد بار توجہ دلائی ہے۔ ارشاد ہوا:

اَفَلاَ يَتَدَبَّرُونَ۔ القرآن وَلَوْكَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِاللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اختِلاَ فاً كَثِيْراً(۹)

کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے ہوتا تو وہ اس میں کثیر اختلاف ضرور پاتے۔

كِتابٌ اَنزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبٰرك لِيَدَّبَّرُوا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الالْبَاب۔(۱۰)

یہ عظیم کتاب ہم نے اسے آپ کی طرف اتارا برکت والی ہے تاکہ وہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل والے اس کو سمجھیں۔

اَفَلاَ يَتَدَبَّرُونَ الْقُراٰنَ۔ اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا۔(۱۱)

کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے قفل ہیں۔

ان آیات میں واضح فرما دیا گیا کہ تدبر فہم قرآن کی بنیادی ضرورت ہے اس لیے کہ

-- اگر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہ ہوتا تو اس کے بارے میں فہم و فراست کے فیصلوں میں کثیر اختلاف ہوتا، غور و فکر سے ایک واضح نتیجہ کا حصول ہی تو دلیل ہے کہ یہ اس حکیم و علیم کا کلام ہے جس کے قول و فعل میں وحدت ہے، قرآن حکیم اس معجزانہ حیثیت کے استخراج کے لیے دعوتِ تدبر دے رہا ہے۔
-- کتابِ الٰہی کے نزول کی برکات کا احساس، آیات پر تدبر کا انعام ہے اور اس سے نصیحت آموزی ارباب عقل ہی کا حق ہے۔
-- تدبر کی نعمت سے بے بہرہ رہنے والوں کی حالت اس محروم و مجبور انسان کی سی ہے جس کے دل کی دنیا بے توفیق ہے۔

ثابت ہوا، اختلافِ کثیر سے محفوظ رہنا، ارباب دانش کہلانا کہ برکات کا نزول ہو اور

زندہ دل کا حامل ہونا، تدبر قرآن کی عطائیں ہیں۔ اسی لیے مسلم امت نے ہمیشہ توحید پر استقامت، کارگہ حیات پر سلطانیت اور مبلغ حسنات ہونے کا ثبوت دیا ہے، حبل اللہ کا اعتصام اور اصل ثابت کا استحکام ہمہ جہت فلاح و کامرانی کا پیغام رہا ہے۔ قرآن کے سایوں میں وسیع جولاں گاہ ہے اور صاحب قرآن کی سیرت میں بے پناہ کشادگی ہے، مفسرین نے ہر دور کے تقاضوں کو جانچا، حدود کو پہچانا اور دائرہ توحید کی پنہائیوں میں حریتِ فکر کا ثبوت دیا۔ پرواز کی وسعتیں انہیں نشیمن سے غافل نہ کر سکیں، قدم لڑکھڑائے بھی تو نوریقین نے ٹھہراؤ بخشا اور آج چودہ سو سال سے زائد کا طویل سفر کرنے کے باوجود ہر فردِ ملت قرآن کی حبل متین سے وابستہ ہے، ہر دور میں ایسا ہوا اور ہر کہیں ایسی صورتِ حال وحدت آشنا کرتی رہی، آیئے برصغیر کی تفسیری کاوشوں کے حوالے سے اس کا سُراغ لگائیں کہ اس سرزمین کو کئی واسطوں سے خدمتِ قرآن کی سعادت حاصل رہی ہے۔

برصغیر پاک وہند کو نہ صرف یہ کہ قدیم تہذیب و ثقافت کی آماجگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ بقول آزاد بلگرامی اسے پہلی وحی کے نزول کا شرف بھی حاصل ہے، علماء نے قرآن مجید میں ہندی الاصل کلمات کی نشاندہی بھی کی ہے جس کی تفصیل اور ناقدانہ جائزہ کا یہ محل نہیں، محمد بن قاسم کی آمد سے برصغیر کا ایک حصہ مملکت اسلامیہ کا حصہ بنا اور تہذیبی مراسم استوار ہوئے، تمدنی اثرات سے علمی پیش رفت کا آغاز ہوا اور اسلامی تعلیمات کا نفوذ نمایاں ہونے لگا، بقول ڈاکٹر حمید اللہ، بزرگ بن شہریار نے کسی ہندی زبان (غالباً سندھی) میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کا ذکر کیا ہے، حضرت سلمان فارسیؓ کے فارسی ترجمے (سورہ الفتح) جس کا ذکر امام سرخسی نے المبسوط میں کیا ہے کے بعد غالباً یہ پہلا مکمل ترجمہ ہے۔[۱۲]

ایک عراقی الاصل شاعر نے ایک ہندو راجہ جو مسلمان ہوا کی فرمائش پر قرآن مجید کی ہندی زبان میں تفسیر بھی مکمل کی۔[۱۳] سلاطین کے دور (۶۰۳ھ/۱۲۰۶ء-۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء) سے مسلمان برصغیر کی برتر قوت تھے اس لیے عرب و ہند کے تعلقات میں مزید استواری آئی اور برصغیر کے علماء نے عرب علماء کے شانہ بشانہ دینِ اسلام کی خدمت کو اپنا شعار بنایا، علمی کارناموں میں تفسیری ادب کو باوقار مقام حاصل رہا، ڈاکٹر سالم قدوائی نے اپنے مقالہ میں

ایک سو چھپن کتب تفسیر کا ذکر کیا ہے جو عربی زبان میں لکھی گئیں، ان میں سولہ مکمل تفسیریں ہیں جو ہر لحاظ سے ان تفاسیر کی مماثل ہیں جو عرب دنیا میں لکھی گئیں، تفسیر المہائمی کو ربط آیات میں امتیاز حاصل ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر المظہری دس ضخیم جلدوں میں معرکے کی چیز ہے جس پر برصغیر بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان (م۱۳۰۷ھ) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری(م۱۳۶۷ھ) کی تفاسیر استناد بالحدیث کے اثری رنگ میں ہیں جبکہ فیضی (م۱۰۰۴ھ) کی سواطع الالہام عربی زبان کا زیور اور فیضی کی لغوی سطوت کا اظہار ہے، ان تفاسیر میں ہم عصر عربی معاییر کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور چند مسلکی اور مقامی اثرات کے باوجود ان کی حیثیت عربوں کی عربی تفاسیر کی سی ہے۔ چند فارسی تفاسیر کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی فتح العزیز جو تفسیر عزیزی کے نام سے مشہور ہے لائق اعتناء اور قابل استفادہ ہے۔

اردو میں تفاسیر کی ابتداء عربی یا فارسی تفاسیر کے تراجم سے ہوئی، مختصر حواشی پر اکتفا کیا گیا اور جزئی تفاسیر مرتب ہوئیں، مختلف سورتوں کا ترجمہ اور تفسیر زیادہ تر تدریسی ضرورت کے حوالے سے ہے مگر یہ شرف بھی اردو زبان کو ہی حاصل ہوا کہ عربی زبان کے بعد سب سے زیادہ تفاسیر اردو میں لکھی گئیں، اس مختصر مضمون میں ہمیں ان تفاسیر کا تعارف اور احصار مقصود نہیں، زیر مطالعہ ان تفاسیر کا اسلوب ہے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ برصغیر کی تفسیری فضا کے مابہ الامتیاز حوالے کون سے ہیں۔

تفسیری ادب کو تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے کے خانوں میں عربوں کے ہاں ہی بانٹ دیا گیا تھا، تفسیر بالماثور کو عظمت حاصل رہی کہ تفسیر بالرائے پر متعدد جوانب سے حملے کیے گئے، تفسیر بالماثور پر اسرائیلی روایات کی بناء پر بھی اور ضعیف اسناد کی بناء پر بہت کچھ لکھا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ محتاط صحابہ کرام اور علماء امت تفسیری روایات کے بارے میں زیادہ انہماک نہ رکھتے تھے۔ تفسیر بالرائے کے جواز اور عدم جواز پر بحث جو عرب علماء کے ہاں موجود تھی برصغیر میں آکر بھی برقرار رہی بلکہ عربی زبان کے علاوہ دوسری کسی زبان میں ترجمہ محل نزاع بنا، شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کے فارسی ترجمہ پر جو ردعمل ہوا وہ آہستہ آہستہ

شدت جذبات سے سطحِ شعور تک آیا، اردو تفاسیر بلکہ برصغیر کی دیگر زبانوں میں تفاسیر کو یہ مشکل درپیش تھی کہ مترادفات یا ہم معنی کلمات کا انتخاب دو زبانوں پر یکساں دسترس چاہتا تھا جس میں مقامی محاورے نے بعض الجھنیں پیدا کیں حتیٰ کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ پر بے شمار حملے ہوئے، ان مشکلات سے علماء برصغیر کیسے عہدہ برا ہوئے اس کے جائزے سے قبل اختصار کے ساتھ تفسیر بالرائے کی حدود متعین کر لینا چاہیے۔

تفسیر بالرائے کے بارے میں ایک نقطہ نظر وہ ہے جس میں ایسی ہر صورت کی نفی کی گئی ہے۔ اس نفی کی بنیاد وہ روایات ہیں جن میں قرآن مجید میں اپنی رائے سے ہر قسم کی گفتگو پر وعید موجود ہے مثلاً

--- حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا " مَنْ قَالَ فِی القُران برأيه فَلْيَتَبوّأ مَقعدَه مِنَ النَّارِ۔[۱۴]

--- دوسری حدیث کے الفاظ یوں ہیں: من قال فی القران بغير علم فليتبوّأ مقعده من النّار۔[۱۵]

--- تیسری حدیث میں پہلی دونوں حدیثوں کا اجتماع ہے: من قال فی القران برأيه أو بما لا يعلم فليتبوا مقعده من النار۔[۱۶]

حضرت ابوبکرؓ کا یہ ارشاد بھی بطور استشہاد پیش کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں: اَیُّ اَرضٍ تُقِلّنِی وَاَیُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِی اِذا قُلتُ فِی القرانِ مالاَ أعلم۔۔ دوسری روایت میں ہے برأی أوبِمَا لاَ أعلَم۔[۱۷]

ان روایات سے ایک گروہ رأی کے ہر قسم کے دخل سے اجتناب کی تاکید کرتا ہے حتیٰ کہ رائے مصیب بھی ہو تو بھی خطاء کار ہے جیسا کہ کہا گیا: وإن اَصَابَ فِيهِ فَمُخطِیٌ[۱۸] کہ وہ دینِ الٰہی میں ظن و گمان کو راہ دے رہا ہے اسی لیے بعض علماء تفسیر کے بارے میں گفتگو سے بچتے تھے جیسا کہ امام الشعبیؒ نے کہا کہ میں تو مرتے دم تک قرآن، روح اور رائے کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ دوسرا گروہ اس تحدید کو مخصوص رویے پر

محمول سمجھتا ہے اور صرف سماع کو ہی تفسیر کی اساس قرار نہیں دیتا بلکہ غور و فکر کے جواز پر اصرار کرتا ہے۔ امام القرطبی نے رائے کے استعمال پر وعید پر کیا:

فحمل بعض أهل العلم هذا الحديث على أنّ الرأى معنى به الهوى، اور توجیہ یہ کی کہ من قال فى القرآن قولاً يوافق هواه۔(۱۹)

وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وليس يدخل فى هذا الحديث أن يفسر اللغويون لغته والنحويون نحوه والفقهاء معانيه و يقول كل واحدٍ باجتهاده المبنى على قوانين علمٍ و نظر فإن القائل على هذهِ الصفة ليس قائلا بمجرد رأيه۔(۲۰)

تفسیر کو صرف سماع پر موقوف جاننے سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فانّ الصحابةؓ قد قرؤا القران واختلفوا فى تفسيره على وجوه وليس كل ما قالوه سمعوه من النبى ﷺ، كان النبى ﷺ دعا لابن عباسؓ وقال: اللهم فقهه فِى الدين و عَلّمِهُ التأويل۔ فإن كان التاويل مسموعاً كالتنزيل فما فائدة تخصيصه بذلك و هذا بيّن لا اشكال فيهِ۔ (۲۰)

علامہ ابن کثیرؒ (م۷۷۴ھ) نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں رائے سے اجتناب اور احتیاط روایت کا ذکر کیا اور آخر پر اس رائے کا اظہار کیا۔

" فأما من تكلم بما يعلم من ذلك لغة و شرعا فلا حرج عليه ولهذا روى عن هولاء وَغيرهم اَقوال فى التفسير ولا منافات لأنهم تكلموا فيما علموه و سكتوا عما جهلوه و هذا هو الواجب على كل احدٍ فانه كما يجب السكوتَ عما لاعلم له به فكذلك يجب القول فيما سئل عنه مما يعلمه۔(۲۲)

ان آراء کی بنیاد پر تفسیر بالرأی کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد حسین الذہبی نے التفسیر والمفسرون، میں التفسیر بالرأی الجائز کے تحت دس اہم تفاسیر کا مفصل تذکرہ کیا، ان میں مفاتیح الغیب للرازی، أنوار التنزیل واسرار التأویل للبیضاوی، مدارك التنزيل و حقائق التأويل للنسفي، لباب التاويل فى معانى التنزيل للخازن، البحر المحيط لأبى حيان، غرائب القرآن ورغائب الفرقان للنيساپوري، الجلالين لجلال الدين المحلى و جلال الدين السيوطى، السراج المنير للخطيب الشرينى، ارشاد العقل السليم لأبى السعود، روح المعانى للآلوسي۔اور التفسیر بالرأی المذموم کے تحت اہل سنت سے ہٹ کر دیگر مسالک و مذاہب کی تفاسیر کی تفصیل دی گئی ہے۔ ان میں معتزلہ، اثنا عشریہ۔ اسماعیلیہ، بابیہ، بھائیہ، زیدیہ اور خوارج وغیرہ شامل ہیں اور پھر صوفیاء، فلاسفہ، فقہاء اور تفسیر علمی کا بیان ہے، یہ معیار تقسیم برصغیر میں بھی برقرار رہا ہے مگر اہلِ دانش کے لیے یہ لمحہ فکریہ ضرور ہے کہ اگرایسی کتاب کوئی ایسا عالم مرتب کر رہا ہوتا جو الذہبی کے نزدیک الرای المذموم کے قبیل سے ہے تو اس کے ہاں کون سی ترتیب ہوتی؟ یہ عمومی اخذ و ترک کا معیار کسی متفق علیہ معیار کا پابند ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یا ذہنی بعد اور ملی افتراق کو اسی طرح باقی رکھنے پر اکتفا کر لیا جائے گا، ہمارا ذوقِ دینی یقیناً اسی تقسیم کا عادی ہے اور اسی پر ہمیں اعتماد و اطمینان بھی ہے مگر عصرِ حاضر کا طالب علم اس سوال کا جواب ضرور چاہتا ہے۔

برصغیر کے مسلمان اپنا نسلی تعلق عربوں سے جوڑیں یا عجمیوں سے مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کی ہر کاوش پر عجمیت کا داغ ہمیشہ سے رہا۔ ابو العطاء السندی جیسے قادر الکلام شاعر پر سے یہ عیب دور نہ کیا جا سکا کہ وہ عجمی اللسان ہے۔ اس میں اہل زبان عربوں کی حس تفاخر کو بھی دخل حاصل ہے اور ہم پر بھی اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم نے اپنے کارناموں کو خود بھی اس نظر سے نہ دیکھا جس کے یہ مستحق تھے، امام الجصاص کی تفسیر کو فقہی دنیا میں جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ برصغیر کی حد تک بھی التفسیرات الاحمدیہ کو حاصل نہ ہو سکی۔ تفسیر المہائمی اور تفسیر المظہری کی علمی وجاہت اور دقتِ نظری سے کون غافل ہے مگر کوئی ایسا ادارہ

قائم نہ کیا جا سکا جو برصغیر پاک و ہند کے شہ پاروں کی اشاعت، ترویج اور ان کے مقام کے تعین کی مخلصانہ کوشش کرتا۔

برصغیر کو تفسیر قرآن کی عربوں سے بڑھ کر ضرورت تھی کیونکہ بقول علامہ رشید رضا " فهولاء الاقوام أشد حاجة إلى التفسير "(۲۳) اور اس ضرورت کو علماء برصغیر نے نہایت مستحسن طریقہ اور انتہائی معیاری صورت میں پورا کیا۔ یہ تصور تو اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا تھا کہ تفسیر صرف قدماء کے خیالات اور روایات کو دہرانے کا نام ہے، یہ تو ابتدائی تفاسیر مثلاً تفسیر طبری میں بھی واضح ہو گیا تھا کہ مفسر کا مقام اور مرتبہ اس کی تفسیر پر اثر انداز ہوتا ہے، کہا گیا کہ

> " ابن جریر کی ادبی اور علمی شخصیت ان کی کتاب کو دوسری صنفِ تفسیر یعنی تفسیر بالدرایۃ میں ایک ایسا مرجع قرار دیتی ہے جس کی اہمیت کسی طرح کم نہیں، کیونکہ انھوں نے مختلف معانی کو ایک دوسرے پر جو لغوی اور علمی پہلوؤں سے ترجیح دی ہے وہ ان روایاتِ منقولہ سے جو انھوں نے اپنی تفسیر میں جمع کی ہیں کہیں بڑھ کر ہے"۔(۲۴)

برصغیر کے علماء تفسیر کے ہاں مراتب کی درجہ بندی ہو چکی تھی اور یہ ایک خوش گوار حقیقت ہے کہ الرای الجائز کی جو فہرست عربوں کے ہاں مستحکم ہو چکی تھی، برصغیر کی تفاسیر میں بھی اس پر اعتماد رہا کوئی تفسیر اٹھائیں ان قدماء کے حوالے ان میں جلوہ ریز دکھائی دیں گے یہ الگ بات کہ اخذ و ترک کے پیمانوں میں قدرے پسند و ناپسند کی کارفرمائی دکھائی دے مثلاً امام رازی کی تفسیر کبیر کے بارے میں مولانا آزاد کہتے ہیں کہ منطقی استدلال کی ہماہمی میں نتیجہ یہ نکلا کہ :"قرآن کے دلائل و براہین کی ساری خوب روئی اور دلنشینی طرح طرح کی بناوٹوں میں گم ہو گئی، حقیقت تو گم ہو ہی چکی تھی لیکن وہ بات بھی نہ بنی جو لوگ بنانا چاہتے تھے۔ شکوک میں ایرادت کے بے شمار دروازے کھل گئے۔ ان کے کھولنے میں تو امام رازی کا ہاتھ بہت تیز نکلا لیکن بند کرنے میں تیزی نہ دکھا سکے"۔(۲۵)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی امام رازی کے بارے میں رائے مختلف ہے، مثلاً وہ

کہتے ہیں: "امام فخر الدین عمر رازی (م۶۰۶ھ) معقول و منقول دونوں کے امام تھے، ان کی تفسیر حقیقۃً تفسیر کبیر یا تفسیر اعظم ہی کہلانے کی مستحق ہے۔ لسانی، روایتی، کلامی، فقہی کہنا چاہیے کہ سارے ہی پہلو اس میں آگئے ہیں اور کلامی مباحث کے تو گویا رازی بادشاہ ہیں۔ مفسر کا کمال یہ ہے کہ اپنے زمانہ کے سارے علوم و فنون کو قرآن کے خادم کی حیثیت سے لا کھڑا کر دیا ہے۔(۲۶)

مولانا عبدالصمد صارم کی رائے ہے کہ "یہ تفسیر جس زمانہ میں تصنیف ہوئی، اگر تصنیف نہ ہوتی تو ہزاروں مسلمان سلام ترک کر چکے ہوتے۔(۲۷)

امام غزالی علیہ الرحمہ نے علم تفسیر کی وسعت کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

"قران کے معانی سمجھنے کا میدان بہت وسیع ہے اور یہ ایک بڑی فراخ جولانگاہ ہے اور پہلے لوگوں سے جو ظاہر تفسیر منقول ہے، اس پر اس بارے میں ادراک کا خاتمہ نہیں ہوگیا۔(۲۸)

یہ بھی حقیقت ہے کہ مفسر کے میلانات، رجحانات اور شخصیت کا نقش اس کی تفسیر پر ضرور اثر دکھاتا ہے، امین الخولی کہتے ہیں "تفسیر کا قصد کرنے والوں کی شخصیت کے آثار ان کی تفسیر پر نقش ہوتے ہیں، خواہ وہ کسی زمانے سے تعلق رکھتے ہوں اور ان کی تفسیر کا طرز و طریقہ کچھ بھی ہو، ان کی شخصیتیں نقلی، روایتی اور عقلی اجتہادی تفسیر دونوں پر اپنا رنگ چڑھا کر رہتی ہیں"۔(۲۹)

برصغیر کی تفاسیر اسی عمومی کلیے سے مستثنٰی نہیں ہیں، عصری تقاضے، گرد و نواح کے اثرات اور مدمقابل کی سطح ذہنی مفسر کو اپنا انداز، لہجہ اور پیش کش بدلنے پر مجبور کرتا ہے، اگرچہ تطابقِ حالات کی حدود ملحوظ رہنا چاہئیں تاکہ شتر گربگی کا انداز پیدا نہ ہو جائے، مصطفیٰ صادق الرافعی کا فیصلہ لائق التفات ہے کہتے ہیں:

"اگر علوم جدیدہ کا کوئی ماہر قرآن میں غور کرے اور جم کر فکر کرے اور سمجھ سے عاری نہ ہو اور کسی بات میں الجھ کر نہ رہ جائے تو اسے قرآن

میں بہت سے ایسے اشارات ملیں گے جن سے حقائق علوم ظاہر ہوتے ہیں۔ گو قرآن جملہ مسائل کو بشرح و بسط پیش نہیں کرتا وہ ان حقائق کی طرف راہنمائی کرتا ہے گو ان کے نام مقرر نہیں کرتا"(۳۰)

مولانا آزاد کو عالم اسلام کے انحطاط اور علمی پستی کا شکوہ ہے: کہتے ہیں " ان کا طریقِ تفسیر ایک روبہ تنزل معیار فکر کی مسلسل زنجیر ہے جس کی پچھلی کڑی پہلی سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے۔ یہ صورتِ حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ تھا، انھوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ ان کی پستیوں کا ساتھ دے سکے۔(۳۵) انھوں نے اس انحطاط فکر کو فلسفیانہ ابحاث اور منطقیانہ روش کا نتیجہ قرار دیا ہے اور ساتھ یہ شکوہ بھی کیا ہے کہ تقلید پرستی نے اس پستی کو مزید گھمبیر بنا دیا ہے، کہتے ہیں:

"اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہوگئی تو ضروری ہوا کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی جائے"(۳۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تفسیر بالرای والوں سے خوش تھے نہ تفسیر بالماثورہ والوں سے مطمئن۔ تفسیر بالرأی کے بارے میں ان کا موقف یہ ہے۔

" تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزش ہوئی ہیں۔ تفسیر بالرائے سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے کیونکہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے--- دراصل تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو

کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے"۔(۳۲)

اس کے بعد مولانا مذاہب کلامیہ، مذاہب فقہیہ، صوفیاء کے طریق کار، جدید سائنسی نظریات اور ان پر کاربند گروہوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی کاوشوں کو تفسیر بالرای کی مذموم صورت قرار دیتے ہیں" مولانا نے ان تمام مباحث کو تفسیر کے لیے اجنبی اور غیر مناسب کہا مگر حیرت ہے کہ ان کی تفسیر علمی مباحث، ذوق جمال اور لغوی تشریحات سے آراستہ ہے، سورہ فاتحہ کے ابتدائی چند اوراق شاہد ہیں کہ ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت سے جو استخراجات مولانا نے نقل کیے ہیں، جمال معنوی، بقاء انفع اور بلاغت کے مجازات پر ان کا قلم بے تکان حقائق آشکار کر رہا ہے، قرآن اور صفاتِ الٰہی کا تصور، کے زیر عنوان جو کلامی مباحث، عقلی استنباطات اور تقابل ادیان کی وضاحت کی گئی ہے وہ عقلی جدلیت نہیں تو کیا ہے اور پھر خصوصیت سے ہندو مذہب، بدھ مت اور دیگر نظریات کا حوالہ مقامی اثرات کی عمدہ مثال ہے، ہندو نظریات شرک سے توحیدی تصور کی نشاندہی مولانا کی بے پناہ قوت استدلال ہی کی مرہونِ منت ہے، اس کے مطالعہ کے بعد اسلام اور ہندو مت کی مغایرت کا وہ شدید جذبہ جو ہندو مسلم نفرت کی بنیاد بنا تھا اس قدر شدید نہیں رہتا اسی لیے ڈاکٹر ذاکر حسین خان (سابق صدر بھارت) نے کہا تھا:

> قرآن مجید حکمت و معرفت کا وہ سرچشمہ ہے جس سے صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ وہ سب اہل دل جو عرفانِ حقیقت کے پیاسے ہیں سیراب ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، ہمارے ہندوستان کی یہ خصوصیت ہے کہ لوگ حق کی ندا خواہ وہ کہیں سے اٹھے سننے کے لیے گوش بر آواز رہا کرتے ہیں، اس لیے غیر مسلموں میں قرآن مجید کی قدر و قیمت کو پہچاننے والے جتنے یہاں مل سکتے ہیں شاید ہی اور کہیں ملیں مگر مشکل یہ تھی کہ اردو کے سوا ہندوستانی زبان میں قرآن کے مستند ترجمے موجود نہیں تھے اور اردو میں بھی کوئی ترجمہ ایسا نہیں تھا جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے دلوں کو بھی کھینچ لے، مولانا ابو الکلام آزاد کے ترجمان

القرآن نے ایک حد تک یہ کمی پوری کر دی ہے"۔(۴۳)

اس مختصر مضمون میں تمام مفسرین کے نقطہ نظر کی وضاحت تو نہیں کر سکتے ایک دو کا جائزہ نہایت اجمال کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر 'تدبر قرآن' کو ربط آیات کے حوالے سے نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مولانا نے تفسیر کے دیباچہ میں اپنے طریقِ تفسیر کا خود ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں:

"ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم ہر سورۃ اور ہر آیت پر اس کے الفاظ، اس کے سیاق سباق اور اس کے نظم اور قرآن میں اس کے شواہد و نظائر کی روشنی میں غور کرتے ہیں اس طرح جو باتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں مزید اطمینان کے لیے ان کو تفسیروں میں بھی دیکھ لیتے ہیں جس نتیجے تک ہم پہنچتے ہیں ان کی تائید اگر تفسیروں سے بھی ہو جاتی ہے تو اس سے مزید اطمینان حاصل ہوتا ہے، اگر تفسیروں سے اس کی تائید نہیں ہوتی تو اس پر غور و فکر جاری رکھتے ہیں تاآنکہ یا تو اپنی غلطی دلائل کے ساتھ واضح ہو جائے یا تفسیروں میں جو بات ہے اس کے ضعف کے دلائل سامنے آ جائیں"۔(۴۴)

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ مولانا کی تفسیری نگارشات کا اصل اعتماد ان کے اپنے غور و فکر پر ہے، مطالعہ تو مزید اطمینان کی خاطر ہے، یہ روش ان کی تفسیر میں ہر کہیں موجود ہے۔ حدیث سے استشہاد کے بارے میں ان کا فیصلہ یہ ہے کہ:

"حدیث قرآن سے متصادم ہوئی تو توقف کیا مگر جب مجھ پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اس حدیث کو ماننے سے یا تو قرآن کی مخالفت لازم آتی ہے یا اس کی زد دین کے کسی اصول پر پڑتی ہے، جہاں تک صحیح احادیث کا تعلق ہے اس کی نوبت بہت کم آتی ہے کہ ان کی موافقت قرآن سے ہو ہی نہ سکے لیکن اگر کہیں ایسی صورت پیش آتی ہے تو وہاں میں نے بہر حال قرآن کو ترجیح دی ہے اور اپنے وجوہ ترجیح تفصیل کے

ساتھ بیان کر دیے ہیں"۔(۳۵)

تفسیر بالرأی میں لغوی، کلامی، فلسفی، منطقی اور سائنسی توجیہات اور عصر موجود کے تقاضوں سے مرعوبیت کا گلہ کیا جاتا ہے اور یہ کہ مفسر بالرأی، احادیث کی تاویلات میں من پسند روش اختیار کرتے ہیں اور سماع و روایت پر ہمہ جہتی اعتماد نہیں کرتے مگر مولانا اصلاحی کے ہاں معانی کی تاویل یا لغت عرب سے بلا واسطہ استشہاد کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مگر سب سے بڑھ کر کہ جسے وہ خود حدیث صحیح قرار دے رہے ہیں اس سے بھی اغماض پر اصرار کرتے ہیں، ظاہر ہے موافقت اگر روایت کے اعتماد پر انحصار رکھتی تو ایسی صورت حال پیش نہ آتی، مولانا کے ہاں اپنے استخراج پر اسی قدر اعتماد ہے کہ پھر علماء سلف کا فیصلہ ہو یا صحابہ کرام کی روش یا حدیث صحیح ہو، کسی کو نظر انداز کر دینا مشکل نہیں رہتا مثلاً " وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔(۳۶) پر تشریحی نوٹ لکھتے ہوئے يُطِيقُونَ کے معانی کے بارے میں کہتے ہیں جس کا معنی بعض مفسرین نے یہ لیا 'کہ جو لوگ مشکل سے طاقت رکھتے ہیں'۔ "اعتراض اس پر یہ وارد ہوتا ہے کہ يُطِيقُون کے یہ معنی لغت میں ہیں بھی یا محض اپنے جی سے گھڑ لیے گئے ہیں، ہمارے نزدیک عربی لغت اس لفظ کے اس معنی سے بالکل خالی ہے"۔(۳۷) اسی طرح 'سلب مادہ' کی توجیہ پر بھی انہیں اعتراض ہے اور وہ کلامِ عرب میں اور قرآن و حدیث میں اس کی کوئی نظیر نہیں پاتے اور ایسے عمل کو عربی زبان پر ظلم قرار دیتے ہیں۔ لکھا "بعض کم سواد یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کہنا فلاں شخص فلاں چیز کی طاقت رکھتا ہے اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اس چیز کی مشکل سے طاقت رکھتا ہے، یہ بات بالکل طفلانہ ہے"۔(۳۸)

بظاہر یہ فیصلہ عربی لغت کی رعائت سے کیا گیا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ طفلانہ بات کن کن مفسرین سے روایت ہوئی ہے۔ تمام تفاسیر سے حوالہ دینا مناسب نہ ہوگا صرف تفسیر ماجدی کا تشریحی نوٹ نقل کرتے ہیں جو تمام تفاسیر کا جامع ہے۔ يطِيقُونه پر تفسیر ماجدی کا تشریحی حاشیہ ہے:

"یطیقونہ میں ضمیر صوم کی طرف ہے یعنی روزہ رکھنے کو رکھ تو ڈالیں لیکن روزہ کا تحمل انہیں مشکل ہی سے ہو سکے، مشقت بہت زائد اٹھانی پڑے مثلاً وہ بوڑھے اشخاص یا حاملہ اور مرضعہ عورتیں، طاقۃ اور وسعۃ میں اہل لغت نے فرق کیا ہے وسعت تو گویا امکان کے مترادف ہے اور طاقت میں یہ مفہوم شامل ہے کہ وہ کام کرنے والے کی قدرت میں تو ہو لیکن اس کے کرنے میں مشقت بہت زائد پڑے، کام تو ہو جائے لیکن یہ مشکل ہو" هو اسم لمقدار ما يمكن ان يفعله بمشقة منه (تاج) الطاقة اسم لمقدار ما يمكن للانسان ان يفعله بمشقة (راغب) الوسع فوق الطاقة فالوسع اسم لمن كان قادراً على الشئى على وجه السهولة واما الطاقة فهو اسم لمن كان قادراً على الشئى مع الشدة والمشقة (كبير) اور یہاں طاقۃ کا مادہ استعمال ہوا ہے جس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ 'وہ لوگ جو تکلیف کے ساتھ روزہ رکھ سکیں مثلاً بوڑھے اور بوڑھیاں، حاملہ اور مرضعہ۔۔۔ (تفسیر کبیر، کشاف اور روح المعانی کے حوالے ہیں)۔ اور ابن عباسؓ کی قراءت میں تو یطوّقونہ، ہے جو صاف مرادف یکلفونہ، کا ہے (قرطبی کا حوالہ ہے) تابعین بلکہ صحابیوں کی متعدد روایتوں میں اس سے مراد بوڑھے اور بوڑھیاں ہی لی گئی ہیں اور متعدد مفسروں نے بھی یہی سمجھا ہے۔ ابن جریر، کبیر، ابن کثیر، قرطبی اور کشاف کے متعدد حوالے دیئے گئے ہیں)۔ (۳۹)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر بالرائے کی تردید ایک رویہ بن گئی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ رد کرنے والے اس اندازِ تفسیر کا عملاً اظہار کر رہے ہیں، ان اقتباسات سے کسی کی تردید مقصود نہیں۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ عرب مفسرین کی اقتداء میں ایسا ہوتا رہا ہے اگرچہ حالات کا جبر، ماحول کا تقاضا اور قرآن مجید کی ہمہ گیریت اور دوامی حیثیت ثابت کرنے کا جذبہ

اپنے اپنے ذوق اور صلاحیت کے مطابق سب میں موجود رہا ہے، یہی تو شرف ہے جو امتِ مسلمہ کو کسی دور میں بھی پس ماندہ، ماضی پرست یا لمحہ موجود سے گریز کرنے والی امت قرار نہ دے سکا، حالات کیسے بھی تھے۔ علم و فن کی جلوہ گری کیسی بھی تھی، قرآن حکیم نے ہر دور میں اپنی برتر حیثیت منوائی ہے اور یہی دلیل ہے کہ یہ ہر دور کے انسان کی کفالت کرنے والا ضابطہ حیات ہے۔ قرآن کے متن میں وحی کا وقار خالق کی رضا کا ثبات اور لفظ و معنی کا جہاں تازہ آباد ہے، گردش لیل و نہار کوئی کروٹ لیں، انسانی زندگی کے تقاضے کوئی سمت اختیار کریں، خیال و تصور کتنی کہکشائیں اسیر کریں، قرآن کا حصار ہر آن ان کا راہنما اور مرشد ہوگا، وہ جہاں بھی ہوں گے قرآن کی سطوت پکارتی رہے گی۔

" يٰمَعْشَرَ الجِنِّ وَالاِنسِ اِنِ استَطَعتُمْ اَن تَنفُذُوا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالاَ رضِ فَا نفُذوا ۔ لاَ تَنفُذُونَ اِلاَّ بِسُلطٰنٍ۔(۴۰)

اے جن و انس کے گروہ! اگر تم آسمانوں اور زمین کے اطراف سے نکلنے کی استطاعت رکھو تو نکل بھاگو، نہ نکل پاؤ گے مگر اس کی سلطانیت ہی ہوگی"

قرآنی بحر علوم و ہدایت میں اس قدر جواہر ہیں کہ خلوص و عقیدت سے محنت کرنے والا مایوس نہیں لوٹتا، مولانا محمد تقی عثمانی کہتے ہیں:

" تفسیر کا آخری ماخذ تدبر اور استنباط ہے، قرآن کریم کے نکات و اسرار ایک ایسا بحر ناپید کنار ہے۔ جس کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالی نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا جتنا اس میں غور و فکر کرتا ہے اتنے ہی نئے نئے اسرار و نکات سامنے آتے ہیں چنانچہ مفسرین کرام اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں" (۴۱)

رائے کا اظہار، تفسیر میں اس کی حیثیت اور اس پر اعتماد صرف اس صورت مستحسن ہوگا کہ اس کے بنیادی تقاضے پیش نظر رہیں مثلاً:

--- عربی لغت پر قابل اعتماد حد تک عبور ہو وگرنہ تفسیر کا حق ادا نہ ہوگا بلکہ ایسا انسان لائق مذمت و تعزیر ہے۔ امام بیہقی تو عربی زبان سے ناواقف مفسر کو سزا دینے کا اعلان کرتے ہیں۔(۴۲) امام ابوبکر الباقلانی کہتے ہیں:

"جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود بلاغت کی مشق و ممارست کے بغیر قرآن مجید کی بلاغت کو تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہے وہ جھوٹا اور باطل گو ہے"۔(۴۳)

ڈاکٹر صبحی صالح نے تفسیر بالرائے پر متوازن گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"تفسیر بالرأی کے بارے میں علماء نے مختلف افکار و آراء کا اظہار کیا ہے، بعض اس کو حرام قرار دیتے ہیں اور بعض جائز، مگر ان کے اختلاف کا حاصل یہ ہے کہ تفسیر بالرأی کی وہ قسم حرام ہے جس میں بلا دلیل و برہان وثوق کے ساتھ کہا جائے کہ خدا کی مراد یہ ہے یا یہ کہ مفسر قواعدِ لغت اور اصول شرع سے بے گانہ ہونے کے باوجود تفسیر قرآن کی جسارت کرے یا بدعات و اھواء کی تائید میں توڑ مروڑ کر قرآنی آیات کو پیش کرے، جب مفسر میں شروطِ مطلوبہ موجود ہوں تو تفسیر بالرأی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔(۴۴)

برصغیر کے تفسیری ادب کا جائزہ لیں تو علماء کی کثیر تعداد اس کی خدمت میں مصروف نظر آتی ہے، نت نئی تفسیر اس بات کی شاہد ہے کہ قرآن کی ہدایت اور اس کی تعلیمات کی روشنی نئے سے نئے فانوس کا تقاضا کر رہی ہے، جب تک دنیا آباد ہے اور زمانے کی کوکھ سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ام الکتاب کی فیضان بخشی جاری ہے، ہم نے صرف چند تفاسیر کا حوالہ دیا کہ مقصود استیعاب نہ تھا وگرنہ عصر حاضر میں امت مسلمہ کی تب و تاب کی حفاظت کے لیے تفہیم القرآن کی مربوط راہنمائی، معارف القرآن کی روایت میں گندھی ہوئی راہبری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی علوم و معارف سے وابستگی، بیان القرآن کی ظاہر و باطن کے لیے دستگیری، کنز العرفان کی لفظ و معنی کی پاکیزگی، ضیاء القرآن کی ضیاء و نکہت باری اور

کئی اور معتبر نام جن سے برصغیر میں اسلامی تعلیمات کی استواری قائم ہے، یہ سرمایہ ایمان افروز بھی ہے اور تشکیل ملت کا ضامن بھی، اللہ کرے کہ یہ سلسلہ نور و نکہت رواں دواں رہے کہ اسی میں امت مسلمہ کی فلاح ہے، آمین۔

حواشی

۱۔ دیوان ابن حجر ص ۲۴

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۶، ص: ۴۹۱

۳۔ ایضاً

۴۔ التفسیر والمفسرون: الذہبی، ج ا، ص: ۱۴

۵۔ فہم القرآن مولانا سعید احمد اکبر آبادی ص: ۳۳، ۳۴

۶۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ا/ ۱۶ ص: ۵۳۱

۷۔ التفسیر والمفسرون ج ا، ص: ۷۴

۸۔ ایضاً، ص: ۲۷۴

۹۔ النساء: ۸۲

۱۰۔ ص: ۲۹

۱۱۔ محمد: ۲۴

۱۲۔ دکنی کلچر ص: ۴۶

۱۳۔ عرب و ہند کے تعلقات علامہ ندوی ص: ۲۴۱

۱۴۔ تفسیر الطبری ج ا، ص: ۲۷

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ حوالہ مذکورہ ص: ۲۹

۱۹۔ تفسیر القرطبی ج: ا، ص: ۳۲، ۳۳

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ تفسیر ابن کثیر ج: ا، ص: ۶

۲۳۔ تفسیر المنار ج:۱ص:۲۵

۲۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج:۶ ص:۴۹۷

۲۵۔ تفسیر ترجمان القرآن مولانا آزاد ج۱ ص:۱۳

۲۶۔ تفسیر ماجدی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی دیباچہ تفسیر

۲۷۔ اردو میں تفسیری ادب، ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی، ص:۴۰

۲۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج:۶، ص۵۰۰۰، ۵۱۱، ۵۰۵

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ تفسیر ترجمان القرآن، ج۱، ص:۹،۱۰،۱۵

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ قرآن حکیم کے اردو تراجم۔ ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم ص:۳۴۵

۳۵۔ تفسیر تدبر قرآن۔ مولانا اصلاحی ج۱ ص:۳۰،۳۲

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ البقرۃ:۱۸۴

۳۸۔ تفسیر تدبر قرآن ج:۱، ص:۴۴۷،۴۴۸

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ تفسیر ماجدی، ص:۶۹

۴۱۔ الرحمٰن : ۳۳

۴۲۔ معارف القرآن مولانا مفتی محمد شفیع ج:۱، ص:۵۲

۴۳۔ فہم القرآن ص:۳۵

۴۴۔ ایضاً

۴۵۔ علوم القرآن۔ صبحی صالح ترجمہ، غلام احمد حریری، ص:۴۱۷